© rasailojaraid.com

فکر و نظر--- اسلام آباد جلد:۴۰-۴۱ شمارہ:۴،۱

تصادم قوانین کا اسلامی تصور اور عمل☆

از ڈاکٹر محمد حمیداللہؒ ☆

قانون کی ایک شاخ ہے جسے خانگی یا شخصی قانون بین الممالک بھی کہتے ہیں اور ''تصادمِ قوانین'' بھی، اگرچہ تصادمِ قوانین اصل میں اس شعبہ علم کے ایک باب کا نام ہے، لیکن اس جزء کا کل پر بھی بلاامتیاز اطلاق عام طور سے ہوتا ہے، اس کی اہمیت میں روز بروز اسی تناسب سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے، جس تناسب سے دنیا کی خود مختار اور مقتدر قوموں میں خود اکتفائی کی جگہ باہمی احتیاج نیز ثقافتی نقطہ نظر سے روشن خیالی اور وسعت قلب بڑھ رہی ہے، اس علم میں زیادہ تر اجنبیوں کی قومیت اور ان کے مسائل شخصی اور ان پر اختیارِ سماعت سے بحث ہوتی ہے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ عمومی قانون بین الممالک اور خانگی قانون بین الممالک میں کوئی مکمل حد فاصل نہیں قائم کی جا سکتی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض مسائل سے ان دونوں علموں میں بحث ہوتی ہے، غالبًا یہی وجہ تھی کہ مسلمان فقہائے سلف نے ان دونوں سے الگ الگ ابواب میں بحث کرنے کے بجائے فقہ کی کتابوں میں ایک ہی باب میں دونوں کا ذکر مناسب خیال کیا تھا، لیکن ہماری موجودہ ضروریات کا تقاضا ہے کہ اس کی کوشش کی جائے کہ متعلقہ مواد کو چن کر الگ کر کے ایک مستقل شکل دینے کی سعی کی جائے، یہ موضوع اس قابل ہے کہ اس پر ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب لکھی جائے، اس موضوع پر مواد کی بھی کوئی کمی نہیں، لیکن آج کی صحبت میں صرف اس کے خط و خال پر عام روشناسی کافی ہوگی۔

میں نے یہاں ''اسلامی تصادم قوانین'' کی اصطلاح عمداً استعمال نہیں کی ہے، کیونکہ اس سے یہ گمان ہو سکتا تھا کہ مختلف مذاہب فقہ میں تصادم ہو، مثلاً ایک فریق مقدمہ سنی ہو اور دوسرا شیعہ، تو فیصلہ کس کے قانون کے مطابق کیا جائے؟ یہاں میں اس سے زیادہ وسیع مفہوم سے بحث کرنا چاہتا ہوں، مسلمانوں کے تصور تصادم قوانین سے بحث کرتے وقت حسب ذیل قسم کے مسائل کا ذکر کرنا

ا۔ ''معارف''، جنوری ۱۹۴۶ء، شمارہ نمبر ۲، جلد ۵، دارالمصنفین اعظم گڑھ، (انڈیا)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوگا:

۱۔ مسئلہ قومیت اور

۲۔ مستامنون یعنی امن لے کر ہمارے ملک میں عارضی طور سے آئے ہوئے غیر ملکیوں ہی سے بحث نہ ہوگی، بلکہ

۳۔ تصادم قوانین سے،

(الف) جب کہ ایک فریق مقدمہ مسلمان اور دوسرا غیر مسلم ہو۔

(ب) جب کہ دونوں غیر مسلم ہوں لیکن الگ الگ ملتوں کے ہوں۔

(ج) جب کہ فریقین مسلمان تو ہوں لیکن الگ الگ مذاہب فقہ کے پیرو ہوں۔

(د) بربنائے تبدیل دین---نیز

۴۔ اسلامی مملکت کی مسلم رعایا کی حیثیت سے بھی جب کہ وہ

(الف) کسی دوسری اسلامی مملکت میں،

(ب) کسی غیر مسلم مملکت میں ہوں،

ایک مختصر مضمون میں سرسری خاکے کے سوا اس پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں، اس کے علاوہ اس مضمون میں صرف راسخ العقیدہ لوگوں کے خیالات سے بحث کی جائے گی۔ ان قدیم یا جدید رواجوں سے بحث نہ ہوگی جو مسلمانوں کی مملکتوں میں پائے تو جاتے ہوں لیکن جن کی اسلامی قانون اجازت نہ دیتا ہو۔

(ا) قومیت

جس چیز کو آج کل ہم قومیت کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں، اس کا آغاز خونی رشتہ سے ہوا ہوگا اور انسانی تمدن میں ترقی پر دیگر عوامل بھی سیاسی وحدتوں میں استحکام پیدا کرنے میں حصہ لیتے رہے ہوں گے۔ چنانچہ ہمیں جغرافی، لسانی، نسلی، رنگی، قبائلی اور دیگر عصبیتوں سے سابقہ پڑتا ہے، اور مختلف زمانوں اور مختلف اقلیموں میں انہی عصبیتوں میں سے کسی نہ کسی کو قومیت کا اثرانداز اور علمی نام دیا جاتا رہا ہے، اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس قسم کا شعور ان سیاسی وحدتوں میں پایا جاتا رہا ہے۔

گہوارۂ اسلام یعنی عرب میں بھی زمانہ جاہلیت میں یہی چیز رہی ہوگی، یہ قدرت الٰہی کا کرشمہ تھا کہ عرب کے قبائلیت زدہ علاقے کے سب سے زیادہ مغرور اور خود پسند گروہ آبادی یعنی قریش کے ایک فرد کا انتخاب اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس غرض کے لئے ہو کہ وہ پیغمبر اسلام کی حیثیت سے خدا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی طرف سے یہ اعلان کرے کہ:

''لوگو! ہم نے تمہیں ایک نر اور ایک مادہ سے پیدا کیا، اور تمہیں قومیں اور قبیلے بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، لیکن یاد رہے کہ تم میں سے سب سے زیادہ معزز خدا کے پاس وہی ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ متقی ہو، بے شک خدا جاننے والا اور باخبر ہے''۔ (قرآن مجید سورہ نمبر ۴۹، آیت ۱۳)

اس اعلان نے قومیت کے مسئلہ پر تصور انسانی میں ایک انقلاب اور ایک نئی مرکزیت پیدا کر دی، آیت بالا کو اسلامی نظریہ قومیت کا منشور اساسی قرار دیا جا سکتا ہے، اس پر عہد نبوی میں اور اس کے بعد سے آج تک ہر زمانہ میں عمل ہوتا رہا اور روئے زمین پر جہاں کہیں ہلال کا پھریرا اڑاتا، اس کے معنی انسانوں میں مساوات اور پرہیزگار کے تقدم کے رہے۔

اس بیان سے بعضوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اسلام میں دین اور قومیت میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ دین کے وہ معنی جو آج کل یورپ میں لئے جاتے ہیں وہ مسلمانوں کا معہود ذہنی نہیں، اس لئے غالباً یہ کہنا محفوظ تر اور صحیح تر ہوگا کہ نسلی، جغرافی، لسانی یا کسی اور مروجہ مفہوم کی رشتہ داری نہیں بلکہ ایک ہی مطمح نظر یا تصور حیات میں شرکت وہ چیز ہے، جسے اسلامی نقطۂ نظر سے قومیت خیال کیا جاتا ہے، کیونکہ اگر فہم دین سے مراد انسان اور اس کے خالق کے تعلقات لیں تو اس معنی کے لحاظ سے اسلام محض ایک دین نہیں رہتا، بلکہ اس سے کہیں وسیع مفہوم رکھتا ہے، چنانچہ اسلام اپنے پیروؤں کو ہر شعبہ حیات میں چاہے وہ روحانی ہو یا مادی و سماجی، مکمل رہنمائی کرتا اور قواعد و احکام بتاتا ہے، اس نقطہ نظر سے اسلام اس برہمنیت کے خلاف بھی احتجاج تھا، جس کے مطابق نجات صرف ان لوگوں کو حاصل ہو سکتی ہے جو برہمنوں کے موروثی طبقے میں پیدا ہوں۔ اسلام اس مسیحیت کے خلاف بھی احتجاج تھا، جس کے لحاظ سے انسان فطرۃً گناہ گار ہے اور اپنے اعمال کے لئے انفرادی طور پر جواب دہ نہیں ہے، بلکہ اس کی نجات کے لئے کسی اور کو قربان کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح وہ اس مجوسیت اور مزدکیت اور بت پرستی وغیرہ کے خلاف بھی احتجاج تھا جو انسانوں سے اس کا اختیار سلب کر لیتے ہوں۔

کوئی شخص اپنی نسلی قومیت کو اصولاً بدل نہیں سکتا، (زمانہ حال میں جو اختیار دیا جانے لگا ہے وہ ذیلی چیز ہے) اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ کوئی اصولاً اپنی لونی یا رنگی قومیت کو بھی بدل سکے، چنانچہ ہندوستانی اور یورپی گو ایک ہی نسل سے سمجھے جاتے ہیں، لیکن جنوبی افریقہ کی سیاسیات میں رنگ کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرق جو معنی رکھتا ہے وہ اس مفہوم کو اچھی طرح واضح کر سکتا ہے، کسی کے لئے اپنی لسانی قومیت کا بدل دینا بھی تقریباً اتنا ہی مشکل ہے، اگر آدم و حوا کے ایک ہی جوڑے کی اولاد میں دوبارہ اتحاد پیدا کرنا اور ان کے مرکز گریز رجحانات کو بھی ضمناً روکنا ہے تو اس کا ذریعہ اسلامی نقطہ نظر سے یہ ہے کہ قومیت کو ایک قدرتی حادثہ کی جگہ اختیاری چیز قرار دیا جائے، اور اسلام نے جس رشتہ کو قومیت کے لئے چنا ہے وہ ایمان یا تصور حیات ہے اس کے علاوہ دیگر اساس ہائے قومیت کے متعلق اسلام نے یہ قرار دیا ہے کہ:

''تمہارا زبانوں اور رنگوں میں اختلاف تو اس میں بے شک (خالق کے کمال کی) نشانیاں جاننے والے لوگوں کے لئے ہیں) (قرآن مجید سورہ نمبر۳۰، آیت ۲۲)

ایمان کے سوا دیگر اساس ہائے قومیت اسلام کے نزدیک کوئی اور معنی نہیں رکھتیں، تقریباً ایک صفحہ پہلے جو آیت نقل کی گئی تھی، اس میں نسلی بنیاد کو اسلام نے ٹھکرا دیا تھا، یہاں لسانی اور لونی فرق کو بہت ہی غیر اہم حیثیت پر پہنچا دیا گیا ہے اور انسان کے اختیار یا ایمان کی ہمہ گیر اہمیت پر زور دیتے ہوئے اسلام نے ایک طرح کا ''بنیادی عقیدہ'' (Basic faith) بھی مرتب کر دیا یعنی وہ کم سے کم چیز جس کا ماننا کسی سچے اور اچھے انسان کے لئے ضروری ہے اور جس کا قبول کرنا انسانوں کی اکثریت کے لئے آسان بھی ہے، چنانچہ ارشاد ہوا کہ:

''جو لوگ (محمد ﷺ کو وحی کی ہوئی چیزوں پر) ایمان لائے اور جو یہودی ہیں اور نصرانی اور صابی--- جو بھی خدا پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک کام کرے، تو یقیناً ایسے لوگوں کا بدلہ ان کے آقا کے پاس ملے گا، اور انہیں نہ کوئی خوف کرنا چاہئے اور نہ ہی وہ افسوس کریں گے''۔ (قرآن مجید ۲/۶۲، نیز ۵/۶۵)

لیکن ناظرین کو ایک چیز بتا دینی چاہئے ورنہ مجھ پر تاریخ سے ناواقف ہونے کا الزام لگایا جائے گا، میں جانتا ہوں کہ تاریخ اسلام میں خود مسلمانوں میں خاصے پرانے زمانہ سے سیاسی، ذیلی قومیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں، ان کا آغاز شیعہ سنی اختلاف سے ہوا اور دیگر شاخوں کا پھوٹنا محض وقت آنے کی بات تھی، کچھ عرصہ بعد تو خود راسخ العقیدہ سنی ائمہ بھی تسلیم کرنے لگے کہ:

لانّ الدّارین فی الاصل ما امتازا الا باجراء الا حکام و تنفید الولایات وکذٰلک الولایات المختلفة فی دار الاسلام بین ملوک الاسلام لاتمتاز الا بالغلبة واجراء الاحکام.

(کتاب الاسرار للدبوسی ورق نمبر ۱۵۱ب مخطوطہ کتب خانہ ولی الدین استانبول)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس طرح دارالاسلام اور دارالحرب میں امتیاز احکام کا اجراء اور نفاذ اقتداء کے سوا کسی اور چیز سے نہیں ہوتا، اسی طرح دارالاسلام کے اندر بھی مختلف علاقوں میں جو اسلامی بادشاہوں کے قبضہ میں ہوتے ہیں، تسلط اور اجرائے احکام ہی سے امتیاز کیا جا سکتا ہے۔

یہ مشہور حنفی امام ابوزید الدبوسی کا بیان ہے جن کی وفات ۴۳۰ھ میں خلافتِ عباسیہ کے زمانہ میں ہوئی تھی، یہاں جس ذیلی تقسیم اور دارالاسلام کے تجربہ کا ذکر ہے، وہ بھی قومیت کے متعلق ذیلی انتخاب ہی کہا جا سکتا ہے، کوئی اٹل اور قدرتی حادثہ نہیں کہا جا سکتا، میں شاید یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی بادشاہتوں کے یہ اختلافات معمولی اور ضمنی چیزیں یا گھریلو جھگڑے ہیں، نہ کہ ایک دوسرے سے جدائی اور علیحدگی و اجنبیت۔

مجھے اس واقعہ سے بھی انکار نہیں کہ جدید مغربی تمدن کے تصادم اور تمارس کے باعث اسلامی مبادیات قابل لحاظ حد تک متاثر ہوئی ہیں، اور حالات سے مجبور ہو کر وہ آج کل قومیت کے لئے ایسے قوانین وضع کر رہی ہیں جو ولادت اور سکونت پر مبنی ہیں، لیکن یہ اصل میں بین الممالک زندگی کی سیاسی ضرورتیں اور اقتضاآت ہیں جن کو میرے اس دعویٰ سے کوئی تضاد نہیں ہے کہ اسلامی تصور کے متعلق قومیت کے معنی ایمان میں اشتراک کے ہیں، ولادت یا رنگ، زبان یا وطن میں اشتراک کے نہیں)۔

اس لئے یہ دیکھ کر حیرت نہ ہونی چاہئے کہ انگلستان میں ایک عیسائی ملک ہونے کے باوجود بعض عیسائی اجنبی ہوں لیکن مسلمان شہری مانے جاتے ہوں، اس کے برخلاف افغانستان میں اجنبی افغانی حقوق شہریت سے بہرہ ور ہندوستانی مل سکیں (اگر مسلمان افغانستان میں اسلامی قانون قومیت نافذ ہو)۔

اسی لئے یہ بات قدرتی ہے کہ مسلمان فقہاء نے اس امر کے متعلق لمبی اور تفصیلی بحث کی ہے کہ ہم وطن اجنبیوں سے کیا برتاؤ کیا جائے، یعنی ان ہم وطنوں سے جو حکمران جماعت سے ایمان و عقائد کے اختیاری مسئلہ میں اشتراک رکھنا پسند نہ کریں، اسی طرح کے ''ہم وطن اجنبیوں'' یا ان لوگوں کے جن کی حفاظت کا اسلامی حکومت ذمہ لیتی ہے (یعنی ذمی یا اہل ذمہ) کے ساتھ برتاؤ کرنے کے متعلق جو قواعد پائے جاتے ہیں، ان کا تفصیلی ذکر اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں، اسلامی مملکت کی سرزمین میں جو لوگ رہتے ہیں، وہ عام طور پر حسب ذیل اقسام کے ہوتے ہیں:-

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

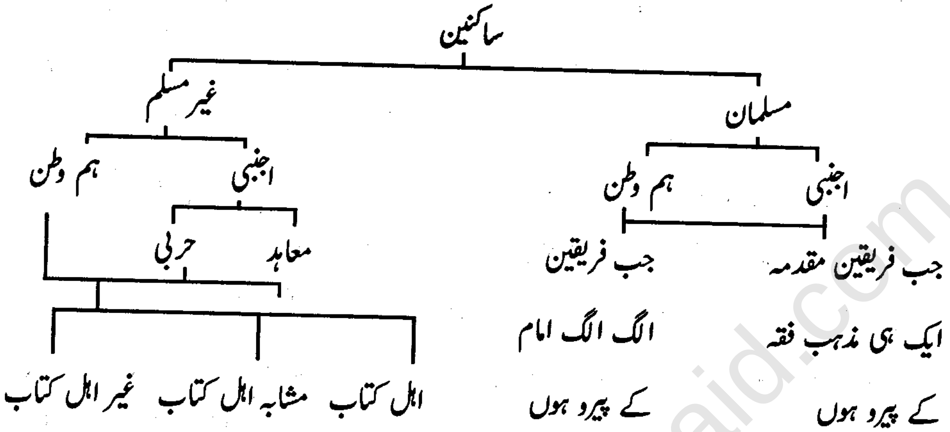

مسلمانوں میں باہم مکمل مساوات پائی جاتی ہے، اور اسلامی قانون میں کوئی طبقہ یا درجہ بندی تسلیم نہیں کی جاتی ہے، جملہ مسلمان ایک ہی امت یعنی قوم سے تعلق رکھتے ہیں، چاہے وہ جہاں بھی ہوں، ایک ہی قانون کے وہ تابع ہوتے ہیں، جیسا کہ امام ابویوسفؒ نے صراحت سے بیان کیا ہے کہ "**المسلم ملتزم احکام الاسلام حیث ما کان**" (بحوالہ مبسوط سرخسی ۹۵/۱۰) لیکن قرآن نے یہ قرار دیا ہے کہ اسلامی مملکت ان مسلمانوں کی حفاظت کی ذمہ دار نہیں ہے، جو غیر مسلم علاقہ میں رہنا پسند کریں اور اسلامی عدالتیں بھی مسلمانوں کے افعال بلکہ مصائب پر جو بیرونی ممالک میں پیش آئیں، کوئی اختیارِ سماعت نہ تو جتاتی ہیں اور نہ عمل میں لاتی ہیں۔

اس بچہ کی امت یا قومیت کا فیصلہ کرنے میں کچھ دشواری پیدا ہوتی ہے، جو لقیط یعنی کہیں پڑا ہوا مل جائے، یا اس کا باپ تو مسلمان ہو لیکن ماں غیر مسلمہ ہو یا باپ ذمی ہو اور ماں اجنبی یا حربیہ ہو اس سلسلہ میں اسلامی قانون نے یہ عام قاعدہ مقرر کیا ہے کہ بچہ اس امت کا سمجھا جائے گا جو اس کے حق میں مفید تر ہو، چنانچہ جو لقیط اسلامی سرزمین میں پایا جائے اور جس بچہ کا باپ مسلمان ہو وہ خود بھی مسلمان سمجھا جائے گا اور جس بچہ کے والدین میں سے ایک کا تعلق اہل ذمہ سے ہو، اور دوسرے کا اجنبی غیر مسلموں سے، تو بچہ ذمی یعنی اسلامی مملکت کی غیر مسلم رعیت قرار دیا جائے گا، لیکن یاد رہے کہ یہ محض بادی النظری قیاس ہوگا جس کی تردید ثبوت پیش کر کے کی جا سکے گی، اسلام ہر مذہب کے لوگوں کے ساتھ رواداری برتتا ہے اور ان کو رعیت بننے کی اجازت دیتا ہے، زبان، رنگ، نسل، دین کے کوئی امتیازات تسلیم نہیں کئے جاتے، صرف ایک چھوٹا سا استثناء ہے اسلام کے روحانی مرکز یعنی جزیرہ نمائے عرب میں مستقل سکونت کے متعلق کچھ پابندیاں ہیں کہ غیر مسلموں کو وہاں بسنے کی اجازت نہ دی جائے، اس سیاسی و سماجی ضرورت سے قطع نظر، عیسائیوں، یہودیوں،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مجوسیوں، بت پرستوں، کالوں، سانولوں، گوروں، سب ہی کو بطور ذمی قبول کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ اطاعت شعار رہ کر اسلامی سرزمین میں سکونت اختیار کرنا چاہیں، چنانچہ امام ابو یوسفؒ نے اپنی کتاب الخراج (ص ۷۳) میں صراحت سے بیان کیا ہے کہ مشرک، بت پرست، اہل کتاب، آتش پرست، سنگ پرست اور دیگر تمام اقسام کے غیر مسلموں کو رعیت اور ذمی بنایا جا سکتا ہے۔

غیر مسلم رعایا اور غیر مسلم اجانب میں بہرحال کچھ فرق پایا جاتا ہے، آخرالذکر کو اسلامی سرزمین میں آنے کے لئے اوّلاً امان یعنی اجازت نامہ حاصل کرنا ہوتا ہے، یہ اجازت حکومت ہی نہیں بلکہ ہر مسلم شہری حتیٰ کہ غلام اور عورتیں بھی عطا کر سکتی ہیں، اس طرح کا اجنبی غیر مسلم اسلامی سرزمین میں اپنے قیام کے دوران میں امان نامے کے شرائط کے تابع ہوگا، لیکن اس سے قطع نظر وہ غیر مسلم رعایا ہی کے برابر حقوق و فرائض کا حامل ہوگا، ابتداً امان کا حق ہر مسلم فرد کو حاصل سمجھا جاتا تھا، لیکن بعد کے فقہاء نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر حکومت چاہے تو صراحت سے اعلان کر کے اس عام حق کو عارضی طور پر معطل اور ایسی شرطیں عائد کر سکتی ہے جن کی تعمیل عام افراد کے لئے ضروری ہوگی۔

دورِ خلافت کی ابتدائی صدیوں میں غیر مسلم اجنبی کا قیام اسلامی سرزمین میں زیادہ سے زیادہ ایک سال کے لئے ہو سکتا تھا، اور اگر وہ اس سے زیادہ عرصہ تک رہنا چاہتا تو یہ تصور کر لیا جاتا کہ وہ توطن کا ارادہ رکھتا ہے اور اس پر وہی محاصل اور واجبات عائد کر دیئے جاتے جو غیر مسلم رعیت کے لئے مقرر ہیں، لیکن حالیہ زمانوں میں غیر ملکی ساکنین (جن کو اصطلاح میں متامن کہا جاتا ہے) سیاسی وجوہ سے یہ چاہنے لگیں کہ طویل قیام کے باوجود اپنی سیاسی قومیت برقرار رکھیں، اس کے معنی مراعات خصوصی کے دور میں ترکی میں خاص کر امتیازی حیثیت رکھنے کے ہوتے تھے، چنانچہ اب سے کوئی چار سو سال قبل ۱۵۳۵ء میں ترکی اور فرانس میں یہ معاہدہ ہوا تھا کہ ایک سال کے بجائے دس سال سے زیادہ قیام پر غیر مسلم اجنبی کے متعلق یہ تصور کیا جائے گا کہ وہ رعیت بننا چاہتا ہے، مراعات خصوصی چونکہ ترکی کے سر جبراً تھوپے گئے تھے، اس لئے مسلمان فقہاء نے کبھی ان کو تسلیم نہیں کیا، اور اپنی کتابوں میں وہ آج تک بدلے ہوئے حالات کے باوجود یہی لکھتے چلے آ رہے ہیں، کہ ایک سال سے زیادہ کا قیام رعیت بننے کے ارادہ کو ظاہر کرتا ہے۔

(۲) غیر مسلم رعیت اور غیر مسلم اجانب کی حیثیت قانونی

اسلامی مملکت کی غیر مسلم رعیت ذمی کہلاتی ہے، ذمی بنانا مسلمان فقہاء کی رائے کے مطابق ایک باضابطہ دو فریقی معاہدہ ہوتا ہے، جو رعیت بننے کے متمنی غیر مسلم شخص اور اسلامی جماعت کے مابین عمل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں آتا ہے، اگر ذمی وفاداری سے رہے اور محصول حفاظت جسے جزیہ کہتے ہیں، ادا کرتا رہے تو اسے سکونت کی آزادی ضمیر کی آزادی اور جان و مال و آبرو کی حفاظت حاصل ہوتی ہے، ذمی بننے کا معاہدہ حسب ذیل صورتوں میں ختم ہو جاتا ہے:

۱۔ بغاوت،

۲۔ جزیہ کے وجوب سے انکار،

۳۔ حکومت کی اطاعت سے انکار،

۴۔ کسی آزاد مسلمان عورت سے زنا،

۵۔ اسلامی مملکت کے کسی دشمن کو پناہ دینا، اور اس کے لئے جاسوسی کرنا،

۶۔ خدا اور رسول اور خدا کی کتابوں کی بے حرمتی کرنا،

۷۔ کسی مسلمان کو مرتد بنانا،

۸۔ لوٹ مار اور ڈاکہ زنی میں مشغول ہونا،

۹۔ اسلام جن چیزوں کو اپنا امتیاز سمجھتا ہے اس کی کھلے بندوں خلاف ورزی کرنا،

۱۰۔ سودی کاروبار میں مشغول ہونا،

اور اسی طرح کی چیزیں،

یہ امر البتہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ ان میں سے بعض امور کی حد تک مختلف مذاہب فقہ میں اتفاق نہیں ہے، جن فقہاء کو اعلیٰ سرکاری خدمات کے سلسلہ میں عملی تجربہ حاصل کرنے کا موقع ملا تھا، وہ بہ نسبت ان علماء کے جو درس گاہوں کے تخلیہ میں نظری خیال آرائی کرتے تھے، عام طور پر نرم تر رائے رکھتے ہیں۔

کسی مسلمان شہری کو سزا میں بھی اسلامی سرزمین سے جلاوطن نہیں کیا جا سکتا، البتہ نظربندی اور شہربدری اس کے معارض نہیں، لیکن کسی غیر مسلم شہری کو نہ صرف سزائے موت اور دوسری چھوٹی سزائیں دی جا سکتی ہیں، بلکہ اسے اسلامی سرزمین سے ملک بدر بھی کیا جا سکتا ہے اگر وہ اپنی مفسدانہ سرگرمیوں کے باعث ایک ناپسندیدہ شخص بن گیا ہو۔

قرآن و حدیث کے احکام اور عہدنبوی سے لے کر اب تک ہر زمانہ میں متواتر و غیر منقطع رواج کے باعث اسلامی سرزمین میں غیر مسلموں کو عدالتی خود مختاری حاصل رہی ہے، عیسائی یہودی اور دیگر ادیان کے پیروؤں کی الگ الگ عدالتیں قائم کی جاتی ہیں، جہاں انہی کے قوانین کا نفاذ انہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ہم مذہب حکام عدالت کے ذریعہ سے عمل میں آتا ہے، البتہ یہ عدالتیں صرف اسی صورت میں کام دے سکتی ہیں، جب فریقین کا دین ایک ہی ہو، غیر مسلموں کو اس کی ممانعت نہیں کہ اپنا مقدمہ اگر خود چاہیں تو اپنی خوشی سے اپنی ملی عدالت کے ذریعہ اسلامی عدالت میں پیش کر سکتے ہیں۔ اگر فریقین مقدمہ الگ الگ دین کے پیرو ہوں مثلاً ایک یہودی اور دوسرا عیسائی تو بھی غالباً اسلامی عدالت ہی میں رجوع ہونا پڑتا اور اسلامی قانون کے مطابق فیصلہ عمل میں آتا لیکن اس بارے میں باوجود تلاش کے مجھے ابھی تک کوئی تصریح اور تفصیل نہیں مل سکی، اگر فریقین ایک ہی دین کے پیرو ہوتے، اور اسلامی عدالت میں آتے تو آنحضرت ﷺ کا طرز عمل قتل اور زنا جیسے مقدمات میں بھی یہی نظر آتا ہے کہ فریقین ہی کے شخصی قانون کے متعلق فیصلہ صادر کیا جائے جیسا کہ بخاری اور ابن ہشام وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔

مجھے یہاں اختلافات کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، جو غیر مسلم رعیت اور غیر مسلم اجانب کی شخصی حیثیت کے متعلق تصادم قوانین کے مختلف پہلوؤں میں پائے جاتے ہیں، البتہ چند نمایاں خصوصیتیں پیش کی جاتی ہیں۔

مسلمان فقہاء یہ رائے رکھتے ہیں کہ ''اختلاف دین اور اختلاف دار'' وراثت کے مانع ہوں گے، چنانچہ کوئی مسلمان مرد کسی عیسائی یا یہودی عورت سے نکاح تو جائز طور پر کر سکتا ہے لیکن نہ تو ایسے شوہر کی وفات پر بیوی کو، اور نہ بیوی کی وفات پر شوہر کو ترکہ میں سے وراثت میں کوئی حصہ ملے گا، بلکہ پورا ترکہ متوفی فرد کے ہم دین قریبی رشتہ داروں (باپ، ماں، بھائی، وغیرہ) میں تقسیم کیا جائے گا۔ اور دوسرے دین کے پیرو رشتہ داروں کو کوئی حصہ نہیں ملے گا، البتہ مرنے والا شخص اپنے رفیق زندگی یا دیگر رشتہ داروں کے لئے جو دوسرے دین کے پیرو ہوں وصیت ضرور کر سکتا ہے، وصیت ان لوگوں کے لئے بھی کی جا سکتی ہے جو غیر ملک کی سکونت اور غیر ملک کی رعیت ہونے کے باعث وراثت سے محروم ہو رہے ہوں، البتہ یہ وصیت جائز اغراض کے لئے ہونی چاہئے، چنانچہ ہمارے فقہاء بیان کرتے ہیں کہ مثلاً عیسائی بیوی کی یادگار میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے گرجا وغیرہ بنانے کے لئے مسلمان شوہر وصیت نہیں کر سکتا، وصیت اور وقف کے لئے غرض کا جائز ہونا ضروری ہوگا، صلہ رحمی، پرورش، خیرات وغیرہ جائز اغراض سمجھے جائیں گے۔

محصول بچت یعنی زکوٰۃ صرف مسلمانوں پر لگائی جاتی ہے لیکن اس سے استفادہ صرف مسلمان نہیں کرتے، چنانچہ علاوہ تعمیرات عامہ سڑکوں، سراؤں وغیرہ کے جو (مثلاً ابن السبیل اور فی سبیل اللہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی مدوں کے تحت) تعمیر کئے جائیں گے، غیر مسلم استفادہ کر سکتے ہیں، خود حضرت عمرؓ کی مستند اور واجب التعمیل تعبیر کے باعث قرآن مجید میں مصارف زکوٰۃ کی مدوں کے سلسلہ میں جو لفظ مساکین آیا ہے، اس میں غیر مسلم بھی شامل ہوتے ہیں۔ (مسلمانوں کے لئے فقراء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور لفظ مسکین کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے کہ وہ ایک ایسا اجنبی ہوتا ہے جو ہمارے علاقہ میں سکونت رکھتا ہے، اسلامی سرزمین میں صرف غیر مسلم ہی مسکین ہو سکتا ہے) اور حضرت عمرؓ نے اسی تعبیر کے تحت یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے اسلامی خزانہ سے روزینے مقرر فرمائے، جیسا کہ امام ابویوسفؒ نے کتاب الخراج میں تحریر فرمایا ہے، جو محصول غیر مسلموں سے ان کے ملی انتظامات کے تحت وصول کریں، وہ متعلقہ ملت ہی کے افراد کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ یہاں شاید یہ بھی بیان کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ اسلامی سرزمین میں ہر شخص کی کھانے پینے اور رہنے سہنے کی ناگزیر ضرورتیں پوری کرنا حکومت کے فرائض میں داخل سمجھا گیا ہے۔ اس غرض کے لئے مسلمانوں سے عام طور پر بچت کا ڈھائی فی صدی سالانہ وصول کیا جاتا ہے، لیکن اگر اس کی آمدنی اور دیگر سرکاری آمدنی کافی ثابت نہ ہوں تو (جیسا کہ ابن حزم نے پوری تفصیل کے ساتھ اور مدلل لکھا ہے) اسلامی حکومت کو حق ہوتا ہے کہ مالداروں سے زکوٰۃ کے علاوہ زائد محصول بھی وصول کر سکتی ہے، جس کی حد امام ابن حزم نے یہ بتائی ہے کہ سدرمق چھوڑ کر باقی ہر چیز جبراً ٹیکس میں وصول کر لی جا سکتی ہے تاکہ ضرورت پر ملک کے بھوکوں اور ننگوں کی ضرورتیں پوری کی جائیں، البتہ یہ اختیاری اور ضرورت کی چیز ہے، لازمی اور ہمیشہ عادت کی نہیں۔

انصاف کا بلند تصور حنفی فقہاء کو اس رائے پر آمادہ کرنے کا باعث بنا کہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کو عمداً قتل کر دے تو قاتل کو سزائے موت دی جائے گی، (اگرچہ بعض دیگر ائمہ اس سے اختلاف کرتے ہیں لیکن حنفیوں کے ہاں اپنی تائید میں ایک صریح حدیث نبوی موجود ہے، اور یہ بھی یاد رہے کہ دنیائے اسلام میں حنفیوں کی تعداد اسی نوے فی صدی سے کم نہیں سمجھی جا سکتی ہے)۔

حکومت کے عہدوں پر غیر مسلموں کے تقرر کی ممانعت میں حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے کا ایک واقعہ مخالفوں کے لئے ایک بڑا بہانہ بنا رہا ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے ایک عامل گورنر کو حکم دیا تھا کہ اپنے کاتب (پرائیویٹ سیکرٹری) کو فوراً اس کی خدمت سے الگ کر دے، تحقیق پر واقعہ یوں معلوم ہوا ہے کہ اس کاتب کی جو عیسائی تھا، عربی بہت کمزور تھی، اور وہ سرکاری مراسلوں میں صرفی و نحوی غلطیاں کرتا تھا، اور ظاہر ہے کہ اس ذمہ دار خدمت کے لئے زیادہ قابل اشخاص کی ضرورت تھی، اگر حضرت عمرؓ نے محض غیر مسلم ہونے کی وجہ سے بھی علیحدہ کیا ہوتا تو بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ حق بجانب ہوتے، کیونکہ اپنے زمانہ میں جب کہ اسلامی فتوحات کو شروع ہوئے چند سال سے زیادہ نہیں گزرے تھے، اہم ذمہ دار عہدوں پر غیر مسلموں کا تقرر خاص کر ایسے علاقے میں جہاں مسلمانوں کی آبادی بے حد قلیل تھی، یقیناً ہزاروں خرابیوں کا باعث ہوتی، (اور آج چودھویں صدی ہجری میں بھی مغرب کی روشن خیال سے روشن خیال حکومتیں بھی اپنی نوآبادیوں میں اہم عہدوں کے متعلق جس قسم کی اجارہ داری برتتی ہیں اس کی موجودگی میں ہمیں کسی معذرت یا ندامت کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں) لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا ایک واقعہ سے قطع نظر حضرت عمرؓ کے زمانہ کا کوئی اور واقعہ ہم کو نہیں ملتا جس میں غیر مسلموں کو سرکاری ملازمت سے الگ رکھا گیا ہو بلکہ اس کے برخلاف قریب قریب پورا محکمہ مالگزاری اور بعض دوسرے محکمے غیر مسلموں ہی کا اجارہ رہے اور ہزاروں عیسائی، یہودی اور پارسی وغیرہ انتہائی اعتماد اور ذمہ داری کے عہدوں پر خود حضرت عمرؓ اور بعد کے زمانوں میں مامور رہے، حتیٰ کہ دفتری زبان بھی فاتح عربوں نے عربی کی جگہ مالگزاری وغیرہ کے محکموں میں فارسی، یونانی وغیرہ ہی رہنے دی اور یہ بھی حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک یہودی--- کی کچھ زمین جبراً خرید کر وہاں مسجد تعمیر کی تو اس کی اطلاع ملنے اور شکایت موصول ہونے پر حضرت عمرؓ نے فوراً وہ مسجد توڑوا دی اور زمین یہودی کو واپس دلوا دی۔ چنانچہ اس جگہ ''بیت الیہودی'' آج تک پایا جاتا ہے، جیسا کہ لبنان کے ایک سابق وزیر عدالت شکری کرواہی نے جو ایک عیسائی ہے بیان کیا ہے۔

اگرچہ غیر مسلم رعایا کو حجاز میں مستقل سکونت اختیار کرنے کی ممانعت کی گئی ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، لیکن خود حضرت عمرؓ کے زمانہ میں غیر مسلموں کو مکہ اور مدینہ میں مسجدوں کے اندر خلیفہ کے خطبہ کے وقت شکایتیں پیش کرنے کی مثالیں ملتی ہیں، اور اس میں کوئی ممانعت اور رکاوٹ عائد نہیں کی جا سکتی تھی، اس قسم کے متعدد واقعات اور ان کا فوری تسویہ تاریخوں نے محفوظ رکھا ہے۔

اسلامی اصول یہ ہے کہ لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ یعنی کسی کو اس کی مرضی کے خلاف دوسرے دین کو قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور جس طرح کا حکم یمن میں اسلام سے پہلے ایک مرتبہ نجرانی عیسائی حکمرانوں نے دیا تھا کہ کوئی یہودی عورت کسی عیسائی کے سوا دوسرے سے خاص کر یہودیوں سے نکاح نہیں کر سکتی تاکہ یہودیت ایک ہی نسل میں ناپید ہو جائے جیسا کہ مشہور فرانسیسی مورخ دے جنس (Desvegens) نے بیان کیا ہے، اس طرح کا کوئی حکم اسلامی دور میں ناممکن ہے، قرآن و حدیث میں غیر مسلم رعایا پر سختیوں کی اتنی شدید ممانعت ہے کہ آج بھی روشن خیال سے روشن خیال مغربی ملکوں کو وہاں تک پہنچنا ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ ایک بہت ہی چھوٹی چیز کو بطور نمونہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیان کر کے ہم اس ذکر کو ختم کریں گے، وہ یہ کہ غیر مسلموں کے قبور تک کو اسلامی حکومت میں چھیڑا نہیں جا سکتا، اور اس کو ذمیوں کے حقوق کی خلاف ورزی شمار کیا جائے گا۔ جیسا کہ ہر فقہ کی کتاب میں مذکور ہے۔ (مسجد نبویؐ کی اولین تعمیر کے وقت جس نبش قبور کا ذکر ملتا ہے، وہ زمینوں کے متعلق نہیں ہے)

(۳) قوانین میں باہم تصادم

(الف)۔ اسلامی اور غیر اسلامی قوانین میں تصادم

اگر فریقین مقدمہ میں سے ایک غیر مسلم اور دوسرا مسلمان ہو، اور بنائے دعویٰ اسلامی سرزمین ہی میں پیدا ہوئی ہو تو مقدمہ اسلامی عدالت میں پیش ہوگا اور عام طور پر اسلامی قانون کے مطابق ہی فیصلہ کیا جائے گا، اس سلسلہ میں دیوانی مقدموں کی حد تک کچھ زیادہ دشواری نہیں، لیکن فوجداری مقدموں میں چند استثناء اور شرائط پائے جاتے ہیں، جو زیادہ تر غیر مسلم افراد کی سہولت کے لئے ہیں، مثلاً چند افعال، شراب نوشی، محرم عورتوں سے نکاح، اور اسی طرح کے امور کا ارتکاب اگر غیر مسلم کریں تو کوئی جرم نہیں سمجھا جاتا، دوسرے قتل انسان کے سلسلے میں اگرچہ بعض ائمہ کی یہ رائے ہے کہ مسلمان قاتل سے جب مقتول غیر مسلم ہو، قصاص نہیں لیا جائے گا، بلکہ اسے صرف خون بہا ادا کرنا ہوگا۔ لیکن حنفی مذہب میں مسلمان اور غیر مسلم رعیت میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا، ایک حدیث نبوی بھی اس رائے کی تائید میں ہے لیکن حنفیوں کے نزدیک بھی اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم مستامن یعنی امن لے کر آنے والے اجنبی کو قتل کر دے، تو مسلمان سے قصاص نہیں لیا جائے گا، مگر حنفیوں میں بھی اس پر پورا اتفاق نہیں ہے، اور ان کے ایک ممتاز فرد یعنی امام محمد شیبانی یہ رائے رکھتے ہیں کہ غیر مسلم مستامن جب تک امان اور اجازت لے کر اسلامی سرزمین میں مقیم رہے اس وقت تک وہ حقوق اور واجبات میں ذمیوں کے برابر ہوگا، اس اصول کے ماتحت مستامن کے قتل پر بھی مسلمان قاتل سے قصاص لازم آتا ہے۔

اسلامی اصول قانون اختیارِ سماعت کے الگ ہونے کے متعلق بہت شدت رکھتا ہے، حتیٰ کہ اگر کوئی مسلمان جو اسلامی مملکت کی رعیت بھی ہو بیرون ملک میں قتل کر دیا جائے یا لوٹ لیا جائے یا کسی اور طریقہ پر اسے کوئی ناجائز نقصان پہنچایا جائے، اور مجرم غیر مسلم ہو اور مقامِ جرم بھی غیر مسلم علاقہ ہو جہاں وہ مسلمان جائز اغراض کے لئے وہاں کی حکومت کی اجازت اور رضامندی سے گیا ہوا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو، اور پھر وہ مجرم اسلامی سرزمین کو اجازت لے کر آئے تو بھی اسلامی سرزمین کی کسی عدالت میں اس کے خلاف اس بارے میں کوئی مقدمہ نہیں چل سکتا کیونکہ فقہاء کا استدلال یہ ہے کہ بنائے نالش کی ابتداء چونکہ ایسے مقام پر ہوئی جہاں اسلامی اختیار سماعت نہیں پایا جاتا تھا، اس لئے اسلامی عدالتیں اس مقدمہ کی سماعت کی مجاز نہیں، جیسا کہ سرخسی نے (مبسوط ۱۰/۹۵ تا ۹۷ میں) لکھا ہے، خود رسول کریم ﷺ کا بھی ایک اور ارشاد وارد ہوا ہے کہ:

اذاهرب الرجل وقد قتل أوزنىٰ اوسرق إلى العدوثم أخَذ أمَانا على نفسِهٖ فانه يقام عليه ما فرمنه و اذا قتل فى ارض العدوا وزنىٰ او سرق ثمَّ اخذا مَانا لم يقم عليه شيىء مِمَّا احدِث فى أرض العدو، (شرح السير الكبير جلد نمبر ۴ ص ۱۰۸، عن عطية ابن قيس الكلابى ان رسول الله ﷺ قال)

جو کوئی (ہماری سرزمین میں) قتل یا زنا یا چوری کا ارتکاب کرے اور فرار ہو جائے لیکن پھر اجازت و امان لے کر واپس آئے تو اس پر مقدمہ چلا کر اسے اس چیز پر سزا دی جائے گی جس سے بھاگنے کی اس نے کوشش کی تھی لیکن اگر اس نے قتل یا زنا یا چوری کا ارتکاب دشمن کے علاقہ میں کیا تھا، اور پھر اجازت لے کر (ہمارے ہاں) آئے تو اسے اس جرم کی جواب دہی کرنی نہیں پڑے گی، جس کا ارتکاب اس نے دشمن کی سرزمین میں کیا تھا۔

(ب)۔ دو غیر مسلم قوانین میں تصادم

اگر فریقین مقدمہ دو الگ الگ غیر اسلامی ملتوں سے تعلق رکھتے ہوں مثلاً ایک یہودی ہو اور دوسرا عیسائی تو اسلامی عدالت میں اس پر توجہ نہیں کرتی کیونکہ مسلمان فقہاء کی رائے کے مطابق جملہ غیر اسلامی ملتیں ایک ہی وحدت کی حیثیت رکھتی ہیں، امام ابوحنیفہ کے الفاظ میں اهل الشرک کلهم ملة واحدة اور امام محمد شیبانی کے الفاظ میں الکفر ملة واحدة دیکھو کتاب الاصل، امام محمد شیبانی کے ۱۴۱/۲ تا ۱۴۲ مخطوطہ کتب خانہ عاطف، استنبول) لیکن اگر مختلف الادیان فریقین مقدمہ اس پر باہم متفق نہ ہوسکیں کہ ان دونوں میں سے کس کی ملی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے تو پھر اسلامی عدالت کو مقدمہ کی سماعت کر کے فیصلہ کرنا ہوگا جیسا کہ مشہور مالکی امام خلیل نے بیان کیا ہے، اس بارے میں دیوانی اور فوجداری مقدموں میں کوئی فرق نہیں، یہ معلوم نہیں کہ مسلمان قاضی کا فیصلہ اس صورت میں کیا ہوگا، جب کہ نزاع مثلاً کسی قرض کے متعلق ہو، جس میں سود دینے کا اقرار ہو، یا کسی بیع کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

متعلق اور شراب مہیا کرنے کا اقرار ہو، چونکہ سود اور شراب اسلام نے منع کر دیئے ہیں، اور یہ ضروری نہیں کہ فریقین مقدمہ کے ادیان نے بھی ان کو ممنوع قرار دیا ہو اس لئے پیچیدگی پیدا ہوگی۔

(ج)۔ دو اسلامی مذاہب فقہ میں تصادم

اسلامی مذاہب فقہ متعدد ہیں، اگر فریقین میں سے ایک سنی اور دوسرا شیعہ ہو، بلکہ خود دونوں کے سنی ہوتے ہوئے بھی ایک حنفی اور دوسرا شافعی ہو تو متعدد مسائل میں تصادم قوانین وقوع میں آ جاتا ہے، اور اس کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ قاضی کس فریق کے مذہب کے مطابق حکم صادر کرے، عہدِ نبوی اور ابتدائی خلفاء کے زمانہ میں اس طرح کا تصادم عملاً پایا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جلد ہی اختلاف رائے کی صورتیں فقہاء میں پیش آنے لگیں صحابہ کے دور میں بھی اور اس کے بعد بھی لیکن چونکہ اس وقت تک قاضیوں پر اس کی کوئی پابندی نہیں تھی کہ وہ کسی خاص فقیہ کی رائے کی تقلید کریں، بلکہ قاضی خود اپنی مستقل حیثیت رکھتے تھے اور اپنے ذاتی اجتہاد کے مطابق فیصلہ کرنے کی پوری آزادی رکھتے تھے، اور اس کا نفاذ بھی کرایا کرتے تھے، اس لئے یہ سوال فقہاء کے اختلاف رائے کے باوجود پیدا نہیں ہوتا تھا، اور یہاں تک ممکن تھا کہ دارالخلافہ کے صدر قاضی کا فیصلہ الگ ہو اور اسی زمانہ میں یا اس کے بعد کسی ضلع یا علاقہ کے قاضی کا فیصلہ الگ ہو، لیکن عباسی دور میں اس کا واضح ذکر ملتا ہے کہ امام ابو یوسف نے جو قاضی القضاۃ تھے، اپنے ماتحت افسران عدالت کو مامور کرتے وقت یہ ضروری قرار دیا تھا کہ وہ حنفی مذہب کے ہوں، بعد کے زمانوں میں پوری مملکت میں ایک ہی قانون ہونے کی ضرورت تسلیم کرتے اور باقی رکھتے ہوئے بھی تقررات کے لئے ایک حل نکالا گیا تھا۔ چنانچہ یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ بعض اوقات خلافتِ عباسیہ میں زیدی شیعوں کو بھی قاضی مقرر کیا جاتا رہا، لیکن وہ مذہب السلطان یعنی حنفی مذہب کے مطابق فیصلہ صادر کرنے کے پابند تھے۔

۲۔ اسلامی مذاہب فقہ میں تصادم کا مطلب واضح کرنے کے لئے بعض مثالیں شاید مفید ہوں، فرض کرو کہ ایک شخص مرتا ہے اور اپنے قریبی رشتہ داروں میں ایک بھتیجا اور ایک نواسا چھوڑے تو حنفی قانونِ وراثت کی رو سے پورا ترکہ بھتیجے کو ملے گا اور نواسا بالکل محروم رہے گا لیکن اگر شیعہ قانون وراثت کے مطابق فیصلہ صادر کیا جائے تو نتیجہ بالکل الٹا ہوگا یعنی پوری جائیداد نواسے کو ملے گی اور بھتیجا محروم رہے گا اور یہ صورت بآسانی ممکن ہے کہ وارث اور مورث الگ الگ مذاہب فقہ کے پیرو ہوں۔ ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرنے والے کے مذہب کے مطابق فیصلہ کیا جائے یا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وارثوں کے مذہب کے مطابق یا اگر وارثوں میں بھی اختلاف مذاہب ہو تو کس وارث کے مذہب کو ترجیح دی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ جس ملک میں قاضی اس امر کے پابند ہیں کہ سرکاری مذہب کے مطابق ہی فیصلہ صادر کریں، (خواہ فریقین مقدمہ کا مذہب کچھ ہی کیوں نہ ہو) تو دشواری نہیں پیدا ہوتی، لیکن اگر حکومت زیادہ روادار اور فراخ دل ہو، اور ہر فرد رعیت کو اس کا حق دیا گیا ہو کہ اس کے مذہب کے مطابق اس کے حقوق اور واجبات متعین ہوں، خاص کر ان معاملات کے متعلق جنہیں آج کل مسائل شخصی کہا جاتا ہے، یعنی نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ تو واقعی تصادم قوانین پیدا ہو جاتا ہے، مثال کے طور پر سلطان صلاح الدین اعظم کے زمانے میں مصر میں، وقت واحد میں چاروں سنی مذاہب کی عدالتیں اور چار چار قاضی القضاۃ پائے جاتے تھے، یعنی شافعی، حنفی، مالکی، اور حنبلی، لیکن اس انتظام سے بھی دشواری حل نہیں ہوتی۔ فریقین مقدمہ ایک ہی مذہب کے پیرو ہوں تو یہ انتظام کارآمد ہو سکتا ہے لیکن اگر ایک فریق مثلاً شافعی اور دوسرا حنفی ہو تو بہت سے مسائل میں تصادم باقی رہتا ہے، قدیم فقہاء اس کا شاذ ہی کہیں ذکر کرتے ہیں، بعد کے زمانہ میں البتہ یہ قرار دے دیا گیا کہ مدعا علیہ اور متوفی ہی کے مذاہب کا لحاظ کر کے فیصلہ صادر کیا جائے گا۔ حنفی، شافعی اور مالکی مملکتوں میں یہی چیز مروج ہے۔ برطانوی ہند میں بھی اسی کو قبول کر لیا گیا ہے تونس اور شام و مصر میں بھی اسی پر عمل ہے۔

ہندوستان اور بعض دوسرے اسلامی ممالک میں اس کے مواقع پیش آتے رہتے ہیں کہ حکمران اپنا مذہب بدل دیں اور سنی سے شیعہ یا شیعہ سے سنی ہو جائیں لیکن تاحال میری تلاش اس امر کے متعلق ناکام رہی ہے کہ اس کا پتہ چلایا جائے کہ مذہب کی اس تبدیلی سے عدل گستری پر کوئی اثر پڑا یا نہیں۔

(د)۔ تبدیل دین کے باعث تصادم قوانین

اگر میاں بیوی دونوں ایک ساتھ اسلام قبول کر لیں تو ان کا سابقہ عقد نکاح برقرار رہتا ہے۔ بشرطیکہ اسلامی قانون کے تحت وہ روا رکھا جا سکتا ہو۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو مثلاً اگر میاں بیوی خویذ وگدس پر عمل کرنے والے پارسی ہوں اور بھائی بہن نے یا باپ بیٹی نے آپس میں نکاح کر لیا ہو یا لامذہب لوگوں نے چار سے زیادہ بیویوں سے ایک ساتھ نکاح کر رکھا ہو یا مہر کے بغیر نکاح کیا ہو، یا ملیبار کے نایر، اور نیلگری اور تبت کے باشندے جو تعدد شوہر ان پر عامل ہوں، اور میاں بیوی ایک ساتھ اسلام قبول کر لیں تو ظاہر ہے کہ ان کا نکاح متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، پارسی بیوی کو فوراً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے شوہر سے تفریق کرا دی جائے گی، تعدد ازدواج پر عامل شوہر چار بیویاں رکھ کر بقیہ سے بے تعلق ہونے پر مجبور ہو جائے گا۔ بے مہر نکاح کرنے والی عورت کو مہر کا حق حاصل ہو جائے گا، تعدد شوہر ان پر عمل کرنے والی عورت کو جملہ شوہروں سے (بجز اپنے منتخبہ ایک کے؟) علیحدگی اختیار کرنا پڑے گی۔

اسی طرح اگر صرف شوہر اسلام قبول کرے، اور بیوی نہ کرے، تو معاملہ میں اچھی خاصی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اگر بیوی اہل کتاب سے مثلاً عیسائی یا یہودی ہو تو شوہر کے اسلام لانے اور کتابیہ بیوی کے اپنے دین پر قائم رہنے سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، اور ان کا سابقہ ازدواج برقرار رہے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغلیہ دور میں ہندوستان میں ہندوؤں کو بھی اہل کتاب تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اور ان سے مسلمان مرد خاص کر شہزادے اور بادشاہ بڑی کثرت سے شادیاں کرنے لگے تھے اور اس کا واضح ذکر ملتا ہے کہ ایسی متعدد ہندو بیویاں اپنے مذہب پر رہیں اور ان کے پوجا پاٹ کے لئے شاہی محلات میں مندر تک تعمیر کئے گئے۔

لیکن اگر بیوی کتابیہ نہ ہو تو اس سے خواہش کی جائے گی کہ مسلمان شوہر کی زوجیت میں رہنے کے لئے تبدیل مذہب کرے، یہ ہو سکتا ہے کہ وہ مسلمان ہونے کے بجائے عیسائی یا یہودی بن جائے لیکن اگر وہ اسلام لانے اور کتابیہ بننے دونوں سے انکار کرے، تو تفریق کرا دی جائے گی۔

اگر صرف بیوی اسلام قبول کرے تو شوہر سے مطالبہ کیا جائے گا کہ تین مہینوں کے اندر وہ بھی اسلام قبول کر لے (اور اس مدت میں تعلقات زنان شوئی غالباً برقرار نہیں رکھے جا سکیں گے) اگر شوہر تبدیل دین سے انکار کرے تو تفریق عمل میں آ جائے گی۔

ظاہر ہے کہ اگر مسلمان شوہر کی کوئی یہودی بیوی مثلاً عیسائیت قبول کر لے تو اس کا اثر ازدواج پر نہیں پڑتا، کیونکہ عیسائیت اور یہودیت دونوں اسلام کے نزدیک بیوی میں گوارا کئے جا سکتے ہیں۔

(۴)۔ مسلمان رعایا یا بیرونی ممالک میں

(الف)۔ کسی دوسری اسلامی مملکت میں

قدیم زمانہ میں بظاہر اس کو زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی کہ مسلمان کہاں کا رہنے والا ہے، اگر وہ محض اتنا ہی ارادہ کر لیتا کہ دو ہفتوں تک قیام کرے گا تو وہ مقامی باشندہ بن جاتا اور مسلمانوں کو سفر کے دوران میں نماز کے قصر کرنے وغیرہ کی جو رعایتیں ملتی ہیں، ختم ہو جاتیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشہور سیاح ابن جبیر نے البتہ بیان کیا ہے کہ اس نے قاہرہ میں دیکھا کہ سلطان صلاح الدین اعظم نے مغرب (یعنی تونس و مراکش) کے باشندوں کے لئے جو مصر میں مقیم تھے، ایک عریف ان ہی میں سے مقرر کیا تھا جو اپنے ہم وطنوں کے مقدموں میں فیصلہ کرتا تھا، ابن جبیر نے اس رعایت پر بڑی تعریف کی ہے اور میرے علم میں ایک اسلامی ملک کے مسلمانوں کے لئے دوسرے اسلامی ملک میں مراعات خصوصی کی یہ واحد مثال ہے۔

موجودہ زمانہ میں البتہ سیاسی قومیت اثر انداز ہوگئی ہے اس کی بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یورپی مملکتیں یہ گوارا نہیں کرتیں، ان کی مسلمان رعایا کسی اسلامی مملکت میں جائے تو اپنے آپ کو اس یورپی ملک کی سیاسی رعیت کے سوا کوئی اور حیثیت دے، اب تو ابن سعود کی سی قدامت پسند و راسخ العقیدہ حکومت میں بھی قوانین قومیت نافذ ہو گئے ہیں، اور ان مسلمانوں پر نافذ ہوئے ہیں جو سعودی عرب کی رعیت بننا چاہتے ہیں۔ ایران، ترکی، افغانستان میں تو عرصہ دراز سے سیاسی قومیت کے لئے قواعد پائے جاتے ہیں۔ البتہ وحدتِ دینی کو اسلام نے جس قدر مستحکم کر دیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بدنام ترکی میں بھی اجنبی مسلمانوں کے ساتھ اتنی محبت کا سلوک ہوتا ہے کہ دیکھنے والے رشک کرتے ہیں اور یہ بیان میں پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر دے رہا ہوں۔

(ب)۔ مسلمان جو غیر اسلامی ممالک میں ہوں

پرانے زمانہ میں مسلمانوں کو بہت سے ملکوں میں خارج الارضی مراعات خصوصی حاصل رہے ہیں، اس سلسلے کا آغاز ان مہاجرین حبشہ سے ہوتا ہے جنھوں نے عہدِ نبوی میں مکہ سے حبشہ ہجرت کی تھی، اور تقریباً بارہ سال تک نجاشی کے ملک میں مقیم رہے، مراعات خصوصی مسلمانوں کو قدیم چین، ترکستان، ملیبار (جنوب مغربی ہند) اور دوسرے بہت سے ملکوں میں حاصل رہے ہیں۔

اس موضوع پر میں نے مجلّہ عثمانیہ ۱۹۴۳ء میں ایک مقالہ لکھا ہے اس کی تفصیل کو دہرانے کے بجائے اس کا حوالہ دے دینا کافی معلوم ہوتا ہے، ان مراعات کا منشا اس زمانہ میں زیادہ تر یہ ہوتا تھا کہ مسلمانوں کو نہ صرف عبادت کی آزادی حاصل رہے بلکہ ان کے آپس کے معاملات ان کے اپنے قانون کے مطابق طے ہوں، جس کے لئے ان کا حاکم عدالت ان ہی میں سے چنا جاتا تھا۔ بعض اوقات تو فریقین ہی نہیں، بلکہ صرف ایک فریق کے مسلمان ہونے کے صورت میں بھی مقدمہ مقامی سرکاری عدالت کی جگہ اسلامی عدالت میں پیش ہو کر اس کا فیصلہ ہوتا تھا لیکن مسلمانوں کے لئے یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مراعات حکمرانوں کے ذاتی رجحانات کے مطابق گھٹتے بڑھتے رہتے تھے، اگر ایک طرف مسلمانوں کے ساتھ رعایتیں ہوتی رہیں تو ناروا سلوک کی مثالیں بھی کم نہیں۔ اس سلسلہ میں مورخ مسعودی نے ایک عجیب و دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ علاقہ خزر میں (جو آج کل انگریزی میں کیپین کہلاتا ہے) ایک خاص مقام کے کسی غیر مسلم حکمران نے مسلمانوں کو اپنی فوج اور اپنی ذات کے محافظ دستے (باڈی گارڈ) کے طور پر بھرتی کیا تھا، اور اپنے ملک میں ملی عدالتوں کا ایک وسیع نظام قائم کیا تھا۔ چونکہ اس کی رعایا میں مختلف ادیان و ملل کے لوگ تھے، اس لئے ملی عدالتیں اور ملی حکام بھی مختلف تھے۔ ان میں مسلمان بھی تھے، مسعودی نے جو خاص دلچسپ بات لکھی ہے وہ یہ ہے کہ جب کبھی دوسرے ملی حکام عدالت کو کسی مشکل مسئلہ سے سابقہ پڑتا جس کا حل ان کے پاس نہ ہوتا تو وہ اسلامی عدالت سے رجوع کرتے اور اسلامی قانون کا اس بارے میں جو فیصلہ ہوتا اس کو قبول اور نافذ کرتے۔ دیکھو مروج الذہب جلد۲ ص ۱۰ تا ۱۲، طبع یورپ) میرے خیال میں اس ملک کے بین الملل قانونی تصادمات ایسے پیچیدہ ہوں گے جن کو ناقابل حل سمجھ کر مسلمان حکام عدالت سے استصواب کیا جاتا ہوگا اور ان کی ناطرفداری اور علمیت کے باعث ان پر اعتماد کیا جاتا ہوگا۔

خاتمہ

مذکورہ بالا مشتے نمونہ از خروارے سے معلوم ہو جائے گا کہ تصادمِ قوانین کے متعلق مسلمان فقہاء کا خیال اور عمل ایک ایسا میدان ہے جس میں ابھی تک کسی نے قدم نہیں رکھا ہے، اور اس میں تحقیقات کی بڑی گنجائش ہے، اور صبر و تحمل سے محنت اور تلاش کرنے والوں کے لئے اس میں بڑی دلچسپ دریافتوں کی امید کی جا سکتی ہے۔

آخر میں اس تذکرے پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ علامہ ابن القیم نے ''احکام اہل الذمہ'' کے نام سے ایک ضخیم اور دلچسپ کتاب لکھی تھی، اس کی پہلی جلد جو چھ سو صفحوں سے زیادہ پر مشتمل ہے، حیدر آباد میں دستیاب ہوئی ہے۔ معلوم نہیں کتنی اور جلدیں تھیں، کتاب خانہ ہائے عالم کی جتنی فہرستیں دستیاب ہوتی ہیں ان میں سے کسی میں اس کا ذکر نہیں ملا ہے۔ حتیٰ کہ ابن القیم کی سوانح عمریاں بھی اس تالیف کے ذکر سے ساکت نظر آتی ہیں، لیکن انداز اور اسلوب مجھے بالکل ابن القیم ہی کا سا نظر آتا ہے، اس میں ہمارے موضوع پر کافی مواد موجود ہے۔ کاش مکمل کتاب دستیاب ہو جائے۔ اگر ناظرین میں سے کسی کو اس کے متعلق کچھ پتہ چلے تو اس کے سننے کا اشتیاق یقیناً مجھے بھی رہے گا اور دوسرے اہل علم کو بھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com